

جناب وحید الدین خان صاحب

قانون سازی کا حق

کسے

حاصل ہے؟

ہمارے تمدنی اور معاشرتی مسائل کا قانون
کیا ہو؟

اب وقت آگیا ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے کہ خدا کی رہنمائی کے بغیر انسان خود اپنے لئے قانون وضع نہیں کر سکتا۔ مذہب کے اندر میں وہ تمام بنیادیں صحیح شکل میں مل جاتی ہیں جو ایک معیاری قانون کیلئے باہرین تلاش کر رہے ہیں، مگر وہ اب تک اسے پا نہ سکے۔
(ادارہ)



تمدنی مسائل کے سلسلے میں بنیادی سوال یہ ہے کہ اس کا قانون کیا ہو؟ تمدنی مسائل انسانوں کے باہمی روابط سے پیدا ہوتے ہیں، اور ان روابط کو جو چیز منصفانہ طور پر متعین کرتی ہے، وہ قانون ہے، مگر یہ حیرت انگیز بات ہے کہ آج تک انسان اپنی زندگی کا قانون دریافت نہ کر سکا۔ کہنے کو اگرچہ ساری دنیا میں قانونی حکومتیں قائم ہیں، مگر یہ تمام قوانین نہ صرف یہ کہ اپنے مقصد میں بری طرح ناکام ہیں بلکہ جبری نفاذ کے سوا ان کی پشت پر کوئی حقیقی وجہ ہوا بھی موجود نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ رائج اوقات قوانین اپنے حق میں علمی اور نظریاتی بنیاد سے محروم ہیں۔

فلر (L.L. FULLER) کے الفاظ میں قانون نے ابھی اپنے آپ کو نہیں پایا ہے اس نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے۔ "قانون خود اپنی تلاش میں۔"

THE LAW IN QUEST OF ITSELF

دور جدید میں ان مسائل پر بے شمار ٹیچر تیار ہوا ہے، بڑے بڑے دماغ اپنی اعلیٰ صلاحیتیں اور اپنے بہترین اوقات اس کے لئے صرف کر رہے ہیں اور جیمز انسائیکلو پیڈیا کے مقالہ نگار کے الفاظ میں "قانون کو ایک زبردست فن کی حیثیت دے کر اس کو عظیم ترقی تک پہنچا دیا ہے۔ مگر اب تک کی ساری کوششیں قانون کا کوئی متفقہ تصور حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک عالم قانون

کے الفاظ میں۔ ”اگر دس قانون والوں کو قانون کی تعریف بیان کرنے کے لئے کہا جائے تو بلا مبالغہ ہم کو گیارہ مختلف قسم کے جوابات سننے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔“

ماہرین قانون کی مختلف اقسام کو الگ کرنے کے لئے انہیں مختلف مکاتیب فکر میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مگر ان کی قسمیں اتنی زیادہ ہیں کہ بہت سے مصنفین اس طرح کی اختیار کردہ وسیع ترین تقسیم کی حد بندیوں میں بھی نہیں آتے۔ مثال کے طور پر جان آسٹن (JOHN AUSTON) کے متعلق پروفیسر پٹن (G.W. PATON) نے لکھا ہے کہ وہ ہماری وسیع قسم بندی (BROAD DIVISION) میں سے کسی ایک میں بھی پوری طرح موزوں نہیں بیٹھتا۔“ (A TEXT BOOK OF JURISPRUDENCE 1905. P.5)

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ماہرین قانون کو وہ صحیح اساس ہی نہیں ملی جس کی بنیاد پر وہ مطلوبہ قانون کی تشکیل کر سکیں۔ وہ قانون کے اندر جن ضروری قدروں کو یکساں کرنا چاہتے ہیں، جب وہ انہیں یکساں کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ یکساں نہیں ہو رہی ہیں۔ اس سلسلے میں ماہرین قانون کی مثال اس شخص کی سی ہے جو میڈیکوں کی پیروی بنا رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ پانچ میڈیکوں کو یکساں کرے گا تو دوسرے پانچ اس کے پڑھے میں سے پھدک کر نکل چکے ہوں گے۔ اس طرح معیاری قانون کو حاصل کرنے کی اب تک کوششیں صرف ناکامی پر ختم ہوئی ہیں۔ فرامڈمین (W. FRIEDMAN) کے الفاظ ہیں :

”یہ ایک حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب کو اس مسئلہ کا کوئی حل اب تک اس کے سوا نہیں مل سکا کہ وہ گاہ بگاہ ایک، انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھک دھکایا کرے۔“

”LEGAL THEORY P-15“

جان آسٹن جس کی کتاب پہلی بار ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئی، اس نے دیکھا کہ قوت نافذہ کے بغیر کوئی قانون نہیں بنتا، اس لئے اس نے قانون کی تعریف یہ کی :

”قانون ایک حکم ہے جو سیاسی طور پر اعلیٰ شخص (POLITICAL SUPERIOR) نے سیاسی طور پر ادنیٰ شخص (POLITICAL INFERIOR) کے لئے نافذ کیا ہے۔“

(A TEXT BOOK OF JURISPRUDENCE-P-56)

اس تعریف میں قانون بس ایک صاحب اقتدار کا فرمان (COMMAND OF THE SOVEREIGN) بن کر رہ گیا۔ (پٹن ص ۷)

چنانچہ بعد کو اس پر شدید اعتراضات کئے گئے۔ نیز حکمرانوں کی بدعنوانی دیکھ کر فہمنوں میں تصور

ابھر کہ قانون سازی میں قوم کی مرضی کو بنیادی حیثیت حاصل ہونی چاہئے۔ چنانچہ ایسے علمائے قانون پیدا ہوئے جنہوں نے کسی ایسے ضابطہ و قاعدہ کو قانون تسلیم کرنے سے انکار کیا جسکی پشت پر قوم کی رضا مندی نہ ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ضابطہ تمام اہل علم اور معلمین اخلاق کے نزدیک صحیح اور مفید ہونے کے باوجود محض اس لئے رائج نہیں ہو سکتا کہ رائے عامہ اس کے خلاف ہے مثلاً امریکہ میں شراب کی پابندی کے قانون کو امریکی قوم کی رضا مندی نہ ملنے کی وجہ سے قانون کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی۔ اسی طرح برطانیہ میں قتل کی سزائیں ترمیم کرنی پڑی اور ہم جنسی جیسی قبیح حرکت کو قانون کی حد میں لانا پڑا۔ حالانکہ ملک کے بیچ اور سنجیدہ لوگ اس کے خلاف تھے۔ اسی طرح یہ بات بھی زبردست بحث کا موضوع رہی ہے کہ قانون قابل تغیر ہے یا ناقابل تغیر۔

قرنِ وسطیٰ اور زمانہ ما قبل تجدید (POST-RENAISSANCE PERIOD) میں قانون طبعی یا قانون فطرت کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان کی جو فطرت ہے وہی قانون کا بہترین ماخذ ہے۔ فطرت کا تعنا یہ ہے کہ ہر شے پر حکومت کا حق خود اسی کے فطری تقاضوں اور رہنما اصولوں کو پہنچتا ہے اور انسان کے لئے قدرت نے یہ اصول اسکی عقل کی شکل میں پیدا کئے ہیں۔ لہذا انسان پر حکومت خود اپنی عقل کے زور سے ہی قائم کی جاسکتی ہے۔ (JURISPRUDENCE BY BODENHEIMER) P-24

اس تصور نے قانون کو ایک آفاقی بنیاد فراہم کر دی۔ یعنی وہ ایک ایسی چیز سمجھا جانے لگا جس کو ہمیشہ ایک ہی رہنا چاہئے۔ یہ صدیوں اور اعتبار ہویں صدی کا تصور قانون تھا۔ اس کے بعد دوسرا مکتب فکر پیدا ہوا اور اس نے دعویٰ کیا کہ قانون کے آفاقی قواعد معلوم کرنا بالکل ناممکن ہیں۔ کوہلر (KOHLER) لکھتا ہے :

"یہاں کوئی ابدی قانون (ETERNAL LAW) نہیں ہے۔ ایک قانون جو ایک

عہد کے لئے موزوں ہو، وہی لازمی طور پر دوسرے عہد کے لئے موزوں نہیں

ہو سکتا۔ ہم صرف اس بات کی کوشش کر سکتے ہیں کہ ہر کچھ کے لئے اس کے

مناسب حال نظام قانون کو فراہم کریں۔ کوئی چیز جو ایک کے لئے خیر ہو، وہی

دوسرے کے لئے مہلک ہو سکتی ہے۔" (PHILOSOPHY OF LAW)

اس تصور نے فلسفہ قانون کا سارا استحکام ختم کر دیا۔ یہ تصور انسانی فکر کو اندھا دھند تغیر پذیری

(RELATIVISM) کی طرف لے جاتا ہے۔ اور چونکہ یہ کسی بنیاد سے محروم ہے اس لئے اسکی کوئی منزل

”راکو پاؤنڈ ایک ایسی بات کہتا ہے، جس کی صداقت پر میں اپنے تمام تجربات اور قانونی مطالعہ کے نتیجے میں بالکل مطمئن ہو چکا ہوں۔ وہ یہ کہ قانون کا ابتدائی دور ہے اور بنیادی مقصد — انصاف کی تلاش۔ (QUEST OF JUSTICE) ہے۔“

مگر یہاں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ انصاف کیا ہے، اور اس کو کیسے متعین کیا جاسکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بات گھوم پھر کر دوبارہ دہریں پہنچ جاتی ہے۔ جہاں آسٹن کو ہم نے چھوڑا تھا، اس طرح سیکنڈریول برس کی تلاش و تحقیق کے باوجود انسان اب تک قانون کی تشکیل کے لئے کوئی واقعی بنیاد فراہم نہ کر سکا۔ یہ احساس روز بروز بڑھ رہا ہے کہ جدید فلسفہ، مقاصد قانون کے اہم مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہا ہے۔

پروفیسر پٹن (G.W. PATON) لکھتے ہیں :

”کیا مفادات (INTERESTS) میں جن کا تحفظ ایک معیاری قانونی نظام کو کرنا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو اقدار سے متعلق ہے اور وہ فلسفہ قانون کے دائرہ بحث میں آتا ہے۔۔۔ مگر اس معاملے میں ہم فلسفہ سے جتنی زیادہ مدد لینا چاہتے ہیں اتنا ہی اس کا حصول مشکل معلوم ہوتا ہے۔ کوئی جی قابل قبول پیمانہ اقدار (SCALE OF VALUES) اب تک دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ درحقیقت صرف مذہب ہی میں ایسا ہے کہ ہم اسکی ایک بنیاد پا سکتے ہیں۔ مگر مذہب کی صداقتیں عقیدہ یا دھرم کے تحت قبول کی جاتی ہیں۔ نہ کہ منطقی استدلال کی بنیاد پر۔“

آگے وہ کچھ علمائے قانون کا یہ خیال نقل کرتا ہے کہ وہ مدتوں فلسفہ قانون کی بھول بھلیاں میں گردش کرنے کے بعد یہ نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ فلسفہ قانون کے مقصد کے فلسفیانہ مطالعہ کی جو کوشش کی ہے وہ کسی نتیجہ تک نہیں پہنچتی (صفحہ ۱۰۶)۔ چیر وہ سوال کرتا ہے: کیا کچھ معیاری اقدار IDEAL VALUES ہیں جو ارتقائے قانون میں اس کی رہنمائی کرتی ہیں۔ (صفحہ ۱۰۸) ایسی اقدار اگر یہ اب تک دریافت نہیں ہوئیں، لیکن وہ قانون کے لئے ناگزیر ہیں۔ مگر دقت یہ ہے کہ مذہب کو الگ کرنے کے حصول کی

کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :

The orthodox natural law theory based its absolutes on the revealed truths of religion. If we attempt to secularize jurisprudence, where can we find an agreed basis of values? P-109.

یہ طویل تجربہ انسان کو دوبارہ اسی طرف لوٹنے کا اشارہ کرتا ہے۔ جہاں سے اس نے اغواف کیا تھا۔ قدیم زمانے میں قانون کی تدوین و تشکیل میں مذہب کا بہت بڑا حصہ ہوتا تھا۔ چنانچہ تالیخ قانون کا ماہر سر ہنری مین (SIR HENRY MAINE) لکھتا ہے :

”تحریری طور پر منضبط قانون کا کوئی ایسا نظام، چین سے پیرو (PERU) تک ہمیں نہیں ملتا جو اپنے دور آغاز ہی سے مذہبی رسوم و عبادات کے ساتھ ہم رشتہ مند رہا ہو۔“ (EARLY LAW AND CUSTOM, P-5)

اب وقت آگیا ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ خدا کی رہنمائی کے بغیر انسان خود اپنے لئے قانون وضع نہیں کر سکتا۔ لا حاصل کوشش کو مزید جاری رکھنے کی بجائے اب ہمارے لئے بہتر ہوگا کہ ڈاکٹر فرانڈمین کے الفاظ میں ہم اعتراف کر لیں کہ :

”ان مختلف کوششوں کا جائزہ لیا جائے تو یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ انصاف کے حقیقی معیار کو معین کرنے کے لئے مذہب کی رہنمائی حاصل کرنے کے سوا دوسری ہر کوشش بے فائدہ ہوگی۔ اور انصاف کے مثالی تصور کو عملی طور پر مشکل کرنے کے لئے مذہب کی دی ہوئی اساس بالکل منفرد طور پر حقیقی اور سادہ بنیاد ہے۔“

(LEGAL THEORY, P-450)

مذہب کے اندر ہم کو وہ تمام بنیادیں نہایت صحیح شکل میں مل جاتی ہیں جو ایک معیاری قانون کے لئے ماہرین تلاش کر رہے ہیں۔ مگر وہ اب تک اسے نہ پاسکے۔

۱- قانون کا مبد سے پہلا اور لازمی سوال یہ ہے کہ قانون کون دے۔ وہ کون ہو جسکی منظوری

(SANCTION) کے کسی قانون کا وجہ عطا کیا جائے۔ ماہرین قانون اب تک اس سوال کا جواب حاصل نہ کر سکے۔ مگر حاکم کو بحیثیت حاکم یہ مقام دیں تو نظری طور پر اسکی کوئی دلیل نہیں ہے کہ ایک یا چند

اشخاص کو دوسرے تمام لوگوں کے مقابلے میں یہ امتیازی حق کیوں دیا جائے اور نہ عملاً یہ مفید ہے کہ ایک شخص کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ جو چاہے قانون اور جس طرح چاہے نافذ کرے۔ اور اگر معاشرہ اور اجتماع کو "قانون ساز" قرار دیں تو یہ زیادہ بہل بات ہے۔ کیونکہ معاشرہ بحیثیت مجموعی وہ علم و عقل ہی نہیں رکھتا جو قانون سازی کے لئے ضروری ہے۔ قانون بنانے کے لئے بہت سی ہمارتوں اور ذمہ داریوں کی ضرورت ہے جس کی نہ عام لوگوں میں صلاحیت ہوتی ہے اور نہ ان کو اتنا موقع ہوتا ہے کہ وہ ان میں حاصل کر سکیں۔ اسی طرح عملاً بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ معاشرہ کی کوئی ایسی رائے معلوم کی جاسکے جو سارے معاشرہ کی اپنی رائے ہو۔

موجودہ زمانے میں اس مسئلے کا یہ حل نکالا گیا ہے کہ پوری آبادی کے عاقل اور بالغ افراد اپنے نمائندے منتخب کریں اور یہ منتخب لوگ اجتماع کے نمائندے کی حیثیت سے اجتماع کے لئے قانون بنائیں۔ مگر اس اصول کی غیر معقولیت اسی سے ظاہر ہے کہ ۱۱ فیصدی کو صرف دو عدد کی اکثریت کی بناء پر یہ حق مل جاتا ہے کہ ۹۹ فیصدی کی نام نہاد اقلیت پر حکمرانی کریں۔ مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طریقے کے اندر اتنے خلا ہیں کہ عموماً ۱۱ فیصدی کی اکثریت بھی حاصل نہیں ہوتی اور مطلق اقلیت کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ اکثریت کے اوپر حکومت بنائے۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں اس وقت ہم جس حکومت کے تحت ہیں وہ ۱۹۴۷ء میں میسرے عام الیکشن کے ذریعہ برسرِ اقتدار آئی ہے۔ کانگریس کو ملک میں یہ اقتدار ۱۱ فیصدی نشستوں پر قبضہ کر کے حاصل ہوا ہے، جبکہ اس کو ووٹ صرف چالیس فیصدی ملے تھے۔ یہی حال آزادی کے بعد پچھلے دنوں الیکشنوں کا بھی تھا۔ ہر بار کانگریس کو پچاس فیصدی سے کم ووٹ ملے۔ مگر اس کے باوجود ہر بار اسی نے حکومت بنائی۔ کیونکہ بقیہ ووٹ پچاس فیصدی سے زائد ہونے کے باوجود مختلف پارٹیوں میں بٹے ہوئے تھے، اور کسی ایک پارٹی کے مقابلے میں کانگریس کے لئے دھندگان کی تعداد زیادہ تھی، صرف اشتراکی ملکوں کے مصنوعی انتخابات اس سے مستثنیٰ ہیں۔

اس طرح فلسفہ قانون کو آج تک اس مسئلہ کا کوئی واقعی حل معلوم نہ ہو سکا۔ مذہب اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ قانون کا ماخذ خدا ہے جس نے زمین و آسمان کا اور ساری طبیعی دنیا کا قانون مقرر کیا ہے۔ اسی کو حق ہے کہ وہ انسان کے تمدن و معاشرت کا قانون وضع کرے۔ اس کے سوا کوئی جی نہیں ہے جس کو یہ حیثیت دی جاسکے۔ یہ جواب اتنا سادہ اور معقول ہے کہ وہ خود ہی بول رہا ہے کہ اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی اور جواب نہیں ہو سکتا۔ یہ جواب اس سوال پر اسی طرح بالکل راست

اُردا ہے، جیسے کوئی دھکن غلط شیٹوں پر نہ بیٹھ رہا ہو، اور جیسے ہی اس کے اصل مقام پر اسے لایا جائے وہ ٹھیک ٹھیک اس پر بیٹھ جائے۔

اس جواب میں قانون بنانے اور حکم دینے کا حق ٹھیک اس جگہ پہنچ گیا، جہاں نہ پہنچنے کی وجہ سے ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہم اس کو کہاں سے جائیں۔ انسانوں کے اوپر انسان کو حاکم اور قانون ساز نہیں بنایا جاسکتا۔ اس کا حق تو صرف اسی کو ہے جو سارے انسانوں کا خالق اور بالفعل ان کا طبعی حاکم ہے۔

۲۔ قانون کا ایک بہت بڑا سوال یہ ہے کہ کیا اس کا سارا حصہ اضافی ہے۔ اس کا کوئی جزو حقیقی نوعیت بھی رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہر وہ قانون جو آج رائج ہے، کل بدلا جاسکتا ہے یا اس کا کوئی حصہ ایسا بھی ہے جو ناقابلِ تغیر ہے۔ اس سلسلے میں طویل ترین بحثوں کے باوجود آج تک کوئی قطعی بنیاد حاصل نہ ہو سکی۔ علمائے قانون اصولی طور پر اس کو ضروری سمجھتے ہیں کہ قانون میں ایک ایسا عنصر ضروری ہے جو دوامی نوعیت رکھتا ہو، اور اسی کے ساتھ اس میں ایسے اجزاء بھی ہونے چاہئیں جن میں ہلک ہو تاکہ بدلتے ہوئے حالات پر انہیں باسانی منطبق کیا جاسکے، دونوں میں سے کسی ایک پہلو کی کمی بھی قانون کے لئے سخت مضر ہے۔ امریکہ کے ایک جج مسٹر کارڈوزو — (JUSTICE CARDOZO) کہتے ہیں :

"آج قانون کی اہم ترین ضروریات میں سے ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ ایک ایسا فلسفہ قانون مرتب کیا جائے جو ثبات اور تغیر کے متضارب تقاضوں کے درمیان توافق پیدا کرے۔"

(THE GROWTH OF THE LAW)

ایک اور عالم قانون لکھتا ہے،

"قانون کو ضرور مستحکم ہونا چاہئے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں جو وہ نہیں پیدا ہونا چاہئے۔ اسی وجہ سے قانون کے متعلق مفکرین نے اس بارے میں کافی جدوجہد کی ہے کہ کس طرح استحکام اور تبدیلی کے دو طرفہ تقاضوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے"

(ROSCOE POUND INTERPRETATIONS OF LEGAL HISTORY. P-1)

مگر حقیقت یہ ہے کہ انسانی قوانین میں اس قسم کا فرق پیدا کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ قانون کے کسی حصہ کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ دائمی اور ناقابلِ تغیر ہے۔ کوئی دلیل چاہتا ہے۔ اور انسانی قانون ایسی کوئی دلیل پیش کرنے سے عاجز ہے۔ آج کچھ لوگ ایک قانون کو اپنی عقل سے دائم قرار دیتے ہیں۔ اور کل

کچھ لوگوں کی عقل کو نظر آئے گا کہ وہ دائمی ہونے کے قابل نہیں ہے اور وہ دوبارہ اس کے قابل تغیر ہونے کا اعلان کر دیں گے۔

خدا کا قانون ہی اس مسئلے کا واحد حل ہے۔ خدا کا قانون ہم کو وہ تمام بنیادی اصول دے دیتا ہے جو غیر متبدل طور پر ہمارے قانون کا لازمی جزو ہونے چاہئیں۔ یہ قانون کچھ بنیادی امور کے بارے میں بنیادی پہلوؤں کا تعین کرتا ہے، اور بقیہ امور اور دیگر پہلوؤں کے بارے میں خاموش ہے۔ اس طرح وہ اس فرق کا تعین کر دیتا ہے کہ قانون کا کوئی ساحصہ دائمی ہے اور کون سا حصہ قابل تغیر ہے۔ پھر وہ خدا کا قانون ہونے کی وجہ سے اپنے ساتھ یہ ترجیحی دلیل بھی رکھتا ہے کہ کیوں ہم اس تعین کو مبنی برحق سمجھیں اور اس کو لازمی قرار دیں۔

یہ خدائی قانون کی ایک بہت بڑی دین ہے۔ بلکہ ایک ایسی دین ہے جس کا بدل فراہم کرنا انسان کے لئے قطعی ناممکن ہے۔

۳۔ اسی طرح قانون کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اس بات کی کوئی معقول وجہ موجود ہو کہ وہ کیوں کسی پیر کو ”جرم“ قرار دیتا ہے۔ انسانی قانون کے پاس اس کا جواب یہ ہے کہ جو عمل ”امن عام یا نظم مملکت“ میں خلل ڈالتا ہو وہ جرم ہے۔ اس کے بغیر اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی فعل کو جرم کیسے قرار دے۔ یہی وجہ ہے کہ قوانین مروجہ کی نگاہ میں زنا اصلاً جرم نظر نہیں آتا بلکہ وہ صرف اس وقت جرم بنتا ہے جبکہ طرفین میں سے کسی نے دوسرے پر جبر کیا ہو۔ گویا انسانی قانون کے نزدیک اصل جرم زنا نہیں بلکہ جبر و اکراہ ہے۔ جس طرح زبردستی کسی کے مال پر ہاتھ ڈالنا جرم ہے۔ اسی طرح زبردستی اس کی آبرو پر دست درازی بھی جرم ہے۔ لیکن باہمی رضامندی سے جس طرح ایک کمال دوسرے کے لئے جائز ہو جاتا ہے۔ اسی طرح گویا قانون کی نظر میں فریقین کی رضامندی سے ایک کی عصمت بھی دوسرے پر حلال ہو جاتی ہے۔ اس باہمی رضامندی کی شکل میں قانون، زنا کا حامی و محافظ بن جاتا ہے۔ اور اگر تیسرا شخص مداخلت کر کے زبردستی انہیں دوکٹا چاہے تو ان کا وہی شخص جرم بن جائے گا۔

زنا کا ارتکاب سوسائٹی میں زبردست فساد پھیلاتا ہے۔ وہ ناجائز اولاد کے وسائل پیدا کرتا ہے۔ وہ رشتہ نکاح کو کمزور کر دیتا ہے۔ وہ سطحی لذتیت کا ذہن پیدا کرتا ہے۔ وہ چوری اور خیانت کی تربیت کرتا ہے، وہ قتل اور اغوا کا فروغ دیتا ہے، وہ سارے سماج کے دل و باطن کو گند کر دیتا ہے۔ مگر اس کے باوجود قانون اسے کوئی سزا نہیں دے سکتا، کیونکہ اس کے پاس نہ ناپاہنچا

کو جرم قرار دینے کیلئے کوئی بنیاد نہیں ہے۔

اسی طرح انسانی قانون کے لئے یہ طے کرنا مشکل ہے کہ وہ شراب نوشی کو جرم کیوں قرار دے۔ کیونکہ اکل و شرب انسان کا ایک فطری حق ہے۔ اس لئے وہ جو چاہے کھائے۔ اس میں قانون کو مداخلت کرنے کی کیا ضرورت۔ اس لئے اس کے نزدیک نہ شراب پینا جرم ہے، اور نہ اس سے پیدا شدہ بدستی اصلاً قابلِ مواخذہ ہے۔ البتہ نشے کی حالت میں اگر مخمور کسی سے گالم گلوچ کر بیٹھایا یا ہتھ پائی کی نوبت آگئی۔ یا شارع عام پر وہ اس طرح جھومتا ہوا چلا کہ خدار کی حرکات سے بالکل نمایاں تھا، تب کہیں جا کر قانون اس پر ماتھ ڈالنا جائز سمجھے گا۔ گویا انسانی قانون کی رو سے فی الحقیقت شراب نوشی کا مغل قابلِ گرفت نہیں ہے۔ بلکہ اصل قابلِ گرفت جرم دوسروں کو ایک خاص شکل میں ایذا پہنچانا ہے۔

شراب نوشی صحت کو تباہ کرتی ہے، وہ مال کے ضیاع اور بالآخر اقتصادی بربادی تک لے جاسکتی ہے، اس سے اخلاق کا احساس کمزور پڑتا ہے، اور انسان دھیرے دھیرے حیوان بن جاتا ہے۔ شراب مجرمین کی ایک بہترین مددگار ہے جس کو پینے کے بعد لطیف احساسات مغفوج ہو جاتے ہیں۔ اور پھر قتل، چوری، ڈاکہ اور عصمت دری کے واقعات کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر قانون اسے بند نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے۔ کہ وہ کیوں لوگوں کے اختیاری اکل و شرب پر پابندی عائد کرے۔

اسی مشکل کا جواب صرف خدا کے قانون میں ہے۔ کیونکہ خدا کا قانون مالک کائنات کی مرضی کا اظہار ہوتا ہے۔ کسی قانون کا خدا کا قانون ہونا بذاتِ خود اس بات کی کافی وجہ ہے کہ وہ بندوں کے اوپر نافذ ہو۔ اس کے بعد اس کے لئے کسی اور سبب کی ضرورت نہیں۔ اس طرح خدائی قانون، قانون کی اس ضرورت کو پورا کرتا ہے کہ کس بنیاد پر کسی فعل کو قانون کی زد میں لایا جائے۔

دیانتداری اور خدمت ہمارا شعار ہے

نوشہرہ فلور ملز لمیٹڈ نوشہرہ اپنے ان ہزاروں کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔
جنہوں نے ہمارا

پستول مارکہ آٹما پسند فرما کر ہماری حوصلہ افزائی کی ہے۔ ہمیشہ پستول مارکہ آٹما استعمال کیجئے جسے آپ بہترین پائیں گے۔

نوشہرہ فلور ملز جی۔ ٹی۔ روڈ نوشہرہ۔ فون نمبر ۱۳۶